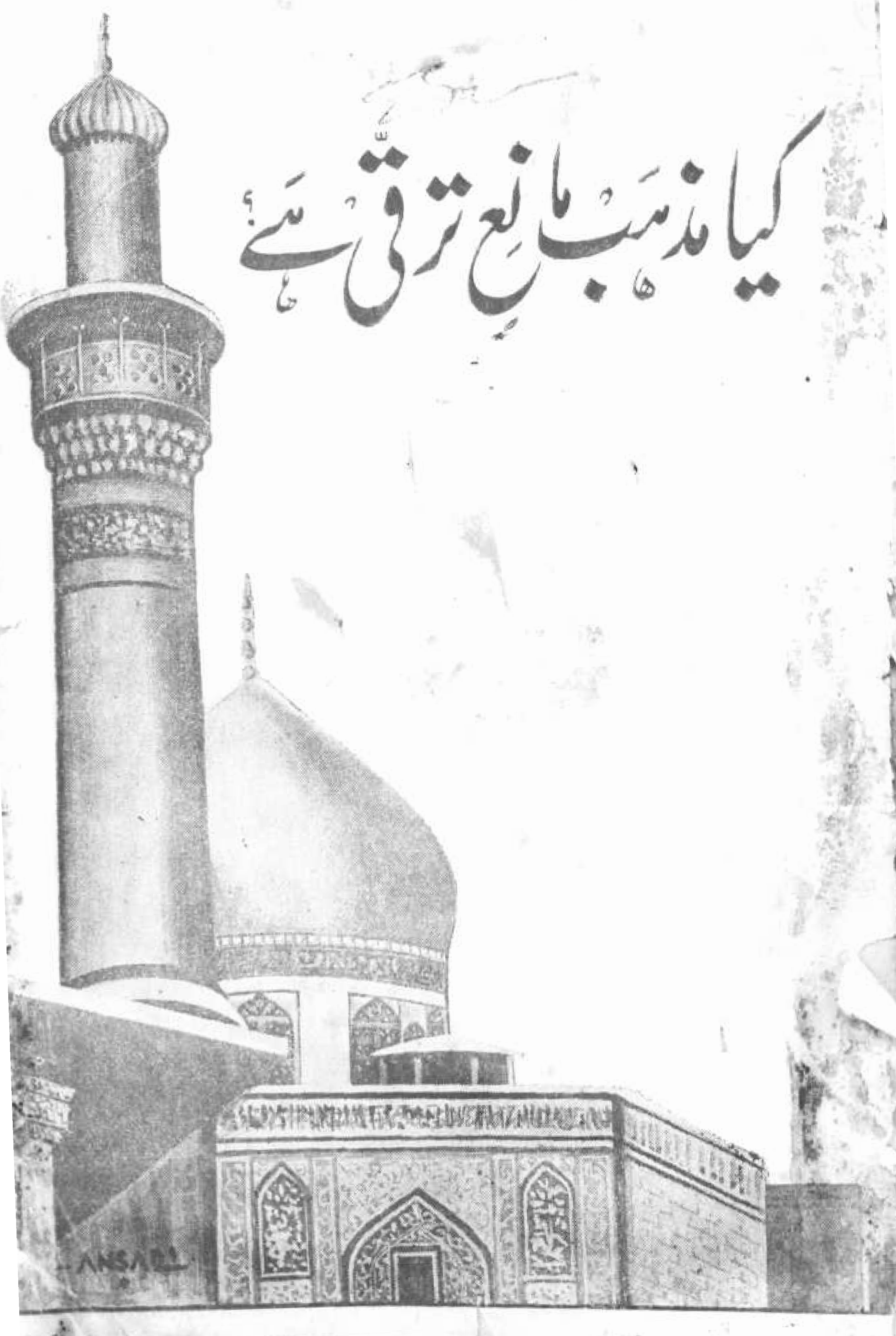
کیا مذہب مانعِ ترقی ہے؟



ضمیمہ "پیام عمل" لاہور اگست ۶۵ء

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور نمبر ۱۸۸

کیا مذہب مانعِ ترقی ہے؟

از قلم

شیخ محمد شریف ایم اے

قیمت ۲۵ پیسے

پیش لفظ

امامیہ مشن پاکستان زیر نظر کتابچہ کو پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کتابچہ میں موجودہ زمانہ کے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کے دلوں میں مذہب کے متعلق جو شکوک شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ انہیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگار جناب شیخ محمد شریف صاحب ایم۔ اے نے حقیقت مذہب کی وضاحت کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ مذہب اسلام تمام بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے لازم و ناگزیر ہے۔ جہاں جہاں اقوام عالم کے منکروں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان کی نشان دہی کی ہے۔ عقیدہ اور عمل کے متوازن امتزاج سے جس اخلاق اور معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے وہی دنیا میں امن اور سلامتی کا باعث ہو سکتا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ جہاں بعض غیر اقوام نے اسلامی اصولوں کو اپنا کر اپنے لئے ترقی کی راہیں کھول لی ہیں۔ وہاں خود اہل اسلام نے ان اصولوں کو فراموش کر کے اپنے لئے ترقی کے تمام رستے مسدود کر دیئے ہیں آپ نے اہل اسلام کو مشورہ دیا ہے۔ کہ اگر آج بھی مسلمان حقیقی اسلام کو پہچان لیں اور اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اور سچے رہنمایان اسلام کے اسوۂ حسنہ کے سانچوں میں اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں۔ تو آج بھی ان کی بگڑی بن سکتی ہے۔ اور وہ دین اور دنیا میں نہایت بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں

پروفیسر محمد صادق قریشی مینجنگ ٹرسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا مذہب مانع ترقی ہے؟ اس عنوان پر گفتگو کرنے اور مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہوگا کہ مذہب کیا ہے؟ اور صحیح معنوں میں ترقی کسے کہتے ہیں؟ جب تک مذہب کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہ آئے گا اور جب تک ترقی کی صحیح حدود متعین نہ کر لی جائیں گی، یہ ہرگز معلوم نہ ہو سکے گا کہ مذہب اور ترقی کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک اور کس طور پر متاثر کر سکتے ہیں؟

یوں تو اس عالم کون و فساد میں سینکڑوں مذہب رائج ہیں اور آئے دن نت نئے مذہب جنم لیتے اور سادہ لوح عوام کا لانعام کی گردیں نئی سے نئی قسم کے طوق اطاعت میں جکڑتے رہتے ہیں لیکن قرآن حکیم کی نظر میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کی رو سے اسلام اور صرف اسلام ہی ہے جسے دین یا مذہب کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ پرکھنے کے لیے کہ کیا مذہب ترقی کے راستے میں مانع ہے صرف دینِ اسلام ہی اس قابل ہوگا کہ جو اس میزان میں تل سکے۔

دنیا کا ہر مذہب خواہ وہ اچھا ہو یا برا، چھوٹا ہو یا بڑا، نیا ہو یا پرانا، ایک نہ ایک ضابطۂ حیات اپنے ماننے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے جس ضابطۂ حیات کو اپنا کر اس مذہب کے پیرو، اس آدرش یا منزلِ مقصود کو پا سکتے ہیں جسے اس نے ان کے لیے درجۂ تکمیل یا نقطۂ آخر قرار دیا ہو۔ چنانچہ یہ کہنے کا مفہوم کہ دنیا

میں مذہب یا دین صرف اسلام ہے سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات باقی تمام مذاہب کی نسبت ہر لحاظ سے مکمل اور متوازن ترین ہے۔ اس سے یہاں مراد نہ تو دنیا کے دوسرے مذاہب کی خواہ مخواہ تنقیص کرنا ہے اور نہ یہ کہنا ہے کہ اسلام کے علاوہ وہ تمام کے تمام محض فضولیات کے پلندے ہیں اور بس! غور سے دیکھا جائے تو کون نہیں جانتا کہ دنیا کے کم و بیش تمام مذاہب میں بنیادی طور پر ایک معتدبہ حصہ دراصل مشترک ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ ایسا ہے جو ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ غور کیجیے وہ کونسا مذہب دنیا میں ایسا ملے گا جو سچائی، بنی نوع انسان سے ہمدردی، دیانت، نیکی، حسن سلوک اور اس قسم کے دوسرے محاسن کو نہ سراہتا ہو۔ اور جو جھوٹ، فریب، بد دیانتی، نفاق اور فساد وغیرہ سے نفرت نہ کرتا ہو۔ قرآن نے یہ کہہ کر کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اسلام کو ایک معیار کی حیثیت دی ہے تاکہ تمام مذاہب اس معیار پر رکھے جا سکیں۔ مراد یہ ہے کہ جو مذہب جتنا حصہ اسلام سے مشترک رکھتا ہوگا وہ اسی حد تک خود اسلام ہی ہوگا۔ خواہ اس کا اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور اسی طرح جو مذہب جس حد تک اسلام سے مختلف اور متصادم ہوگا اسی حد تک اسے دائرۂ مذہب سے خارج سمجھنا پڑے گا۔ بہر حال سوائے اسلام کے دنیا کا کوئی اور مذہب ایسا نہیں جو دین و دنیا کی یکساں طور پر ہر طرح کی متوازن اور صحت مند

ترقی کا ضامن قرار پا سکے۔ غور کیجیے کیا رہبانیت جسے ہندومت اور عیسائیت دونوں واجب نہیں تو مستحسن ضرور قرار دیتے ہیں، بنی نوع انسان کی نسلی ترقی کے راستے میں صاف صاف اور بالکل بدیہی طور پر حائل معلوم نہیں ہوتی؟ اور اسی طرح کیا بدھ مت اور جین مت کے وہ احکامات، جو نہ صرف جائز اور حلال جانوروں کے گوشت سے پیٹ پالنے کی انسانی خواہش پر ہی پہرہ بٹھاتے ہیں بلکہ مضر سے مضر اور سانپ بچھو اور بھیڑیئے جیسے زہریلے سے زہریلے جانوروں تک کو ہلاک کرنا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کے سب نسل انسانی کی جسمانی ترقی سے واضح طور پر ٹکراتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے؟ اور یونہی کیا ہندومت کی ذات پات کی تمیز انسانی مساوات کی بیخ کنی کرتے ہوئے ابتدا ہی سے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی اکثریت کے لیے ترقی کی تمام راہیں ابدی طور پر مسدود نہیں کر دیتی؟

یہاں یہ اعتراض نہ کیجیے کہ اسلام بھی تو بعض حالات میں جنسی تعلقات کو روکتا اور غذا و خوراک کے میدان میں حلال و حرام کی حدیں قائم کرتا اور بہت سے جنگلی جانوروں کی زندگی کا احترام کرنے بلکہ ان کی افزائش نسل میں مدد دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ میں کہوں گا، یہی تو ایک متوازن اور غیر متوازن دین میں فرق ہے۔ اور یہی وہ ایک بنیادی فرق ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔ حیات انسانی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور حقیر سے حقیر شعبہ ایسا نہیں مل سکتا جس میں

اسلام نے "ہاں" اور "نہ" کے احکامات نہ جاری کر دیے ہوں، اور جہاں اس دین نے مثبت اور منفی لکیریں نہ کھینچ دی ہوں۔ جہاں جہاں تک ترقی کرنے، نشو و نما پانے اور آگے بڑھنے کا جذبہ اجازت دیتا تھا اسلام نے میدان صاف کر کے جواز کو استحباب و وجوب کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے اور جہاں سے یہ حدود اس جذبہ سے متصادم ہوتی تھیں۔ وہاں سے سلسلہ کاٹ کر حسب اہمیت اس کا رخ کراہیت و حرمت کی طرف موڑ دیا ہے۔ چنانچہ جو کچھ ہمارے لیے ضروری اور لابدی تھا اسے واجب کر دیا اور جو کچھ مُضِر و نقصان دہ تھا اسے حرام ٹھہرایا۔ جس سے اچھائی بڑھتی تھی اسے مستحب کہا اور جس سے پرہیز زیادہ مناسب تھا اسے مکروہ گردانا۔ جہاں جہاں منفعت و نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اسے جائز و حلال کے وسیع و عریض دائرہ کے لیے چھوڑ دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصل اسلام کیا ہے؟ اور اس کے وہ کون کون سے بنیادی عناصر یا اجزا ہیں جنھیں انسانی ترقی کی مقدار یا حدود ناپنے کے لیے میزانِ معیار میں آنا چاہیے۔ یوں تو مذہب اسلام کا کوئی خفیف سے خفیف اور چھوٹے سے چھوٹا حکم بھی ایسا نہیں کہا جا سکتا جس کی خلاف ورزی جائز ہو سکے — یہ ایک مکمل مجموعہ ہے جو جب تک مکمل ہے اسلام ہے اور جس کے کسی پہلو یا جزء سے سمجھوتہ ممکن نہیں — تاہم اصولِ دین اور فروعِ دین کی تقسیم اور گناہ

کبیرہ و صغیرہ کا اختلاف خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس دین کے ہر جزء کی اہمیت یکساں نہیں۔ اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بدقسمتی سے عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے بہت سی ایسی غیر معقول اور غیر ضروری روایات کو اصلِ اسلام کا نام دے رکھا ہے جن کا روحِ اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسی ملائیت اور جہل کی شکایت علامہ اقبال نے یہ کہہ کر کی تھی کہ ؎

یہ امت روایات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

بہرحال خود شریعتِ مطہرہ کی رو سے اسلام کی بنیاد اصولِ دین ہیں اور اس کی شاخیں فروعِ دین اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت اس پلستر یا چونے کی تو ہو سکتی ہے جو ایک عمارت کو سجاتا، سنوارتا اور مضبوط بناتا ہو لیکن جو اس کا جزوِ لاینفک قرار نہیں پا سکتا۔ اصولِ دین پانچ ہیں، توحید، رسالت، امامت، قیامت اور عدل اور فروعِ دین چھ ہیں، — نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس اور جہاد — اول الذکر کا تعلق عقیدہ سے ہے اور آخر الذکر کا عمل سے۔ ان دونوں کی پابندی لازمی ہے۔ اور یہی دونوں اسلام کی روح اور اس کے نچوڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دینِ اسلام کی ان جڑوں اور شاخوں پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ — توحید پر ایمان لانے کا مطلب خدا کی ان جملہ صفات کو ماننا ہوگا، جن سے وہ ذاتِ واجب متصف ہے

اور اسی طرح نبوت و امامت کا عقیدہ، وہ سب کچھ منوائے گا جو رسول یا امام منہ سے کہے اور عمل کر کے دکھلائے، قیامت پر ایمان، دنیا و آخرت کے پورے مسئلہ پر ایمان ہوگا۔ اور عدالت کا اعتراف خدا اور خدا کی پیدا کی ہوئی ہر شے کے توازن اور اس کی فطری صحت کا ضامن قرار پائے گا۔ اور اسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس اور جہاد پر ایمان پورے فقۂ اسلامی پر ایمان، حلال و حرام کی جملہ قیود کا اعتراف اور انسان کی روزمرہ کی زندگی کو ایک نپے تلے دستور العمل میں جکڑ دینے کا مترادف ہوگا۔

نفس مذہب پر اس مختصر سی بحث کے بعد آیئے اب غور کریں کہ ترقی کسے کہتے ہیں اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہونا چاہیے؟ ترقی عبارت ہے آگے بڑھنے اور حرکت کرنے سے۔ ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود کو پا لینے کے لیے صرف آگے بڑھنا کافی نہ ہوگا جب تک کہ صحیح سمت کا تعین پہلے سے نہ کر لیا جائے۔ اگر آپ کی سمت یا جہت صحیح ہے تو ہر اٹھنے والا قدم آپ کو منزل سے قریب لے جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے اگر آپ کی سمت تھوڑی سی بھی غلط ہو گئی تو اب آپ جتنا آگے بڑھتے جائیں گے اسی قدر منزل سے بُعد اور دوری بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ تو گویا منزل پر پہنچنے کے لیے صرف آگے بڑھتے چلے جانا ہی کافی نہ ہوا، بلکہ پہلے سے صحیح سمت کا تعین اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ٹھہرا۔ اور اگر ایک انسان کا منتہائے مقصود ایک خوشحال زندگی بسر کرنا اور ایک

صحت مند اور خوشگوار معاشرے کی تشکیل و تخلیق میں مدد دینا ہی ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ ترقی صرف وہی ترقی ہوگی جو اس مقصد کے حصول کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ یعنی جو نہ صرف اس انسان کے لیے ذاتی طور پر خوشگوار و صحت مند نتائج برآمد کرے بلکہ عام معاشرہ کے لیے بھی اسی درجہ متوازن اور نفع بخش ثابت ہو سکے۔ ورنہ اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جانا اور بغیر سوچے سمجھے دوڑنا حماقت بھی ہوگا اور جلد یا بدیر مسافر کو کسی انجان وادی میں آوارہ و پریشان چھوڑ دینے کا ذمہ دار بھی۔

آیئے اس تمہید کے بعد اب غور کریں کہ مذہب ترقی کے راستہ کو کیونکر متاثر کرتا ہے؟ صورتِ حال تین شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ یا مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا موجب ہوگا، یا مذہب اور ترقی کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اور یہ دونوں اپنے اپنے مقام پر الگ الگ مصروفِ کار رہیں گے یا پھر تیسری صورت میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری اور ممد و معاون قرار پائیں گے۔ بیچ کی صورت میرے خیال میں خارج از بحث ہے۔ مذہب کا تعلق انسانی دل و دماغ اور عقائد و خیالات سے ہے اور ترقی نام ہے آگے بڑھنے اور حرکت کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ جن عقائد و خیالات سے انسان کا ذہن متاثر ہوگا ان کا عکس اس کے اعمال و کردار میں لازمی طور پر ملے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ ذہن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کوئی اس قسم کی قید یا بندش عائد نہ کی کہ دیکھنا یہ علم تو حاصل کرنا لیکن اس دوسرے علم کے نزدیک مت جانا۔ اور اچھے علوم کے لیے تو تگ و دو کرنا لیکن بُرے علوم کو مت چھُونا۔ اسلام خوب جانتا تھا کہ علم، علم ہے خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو۔ وہ تو ایک شمشیر کی حیثیت رکھتا ہے، جو اپنے مالک کے لیے طاقت و توانائی کا موجب ہوا کرتی ہے۔ رہا یہ کہ کون اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کون نقصان، تو اس کا انحصار بعینہ اس صاحبِ شمشیر پر ہے۔ وہ چاہے تو اسے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کرے اور چاہے تو خود اپنوں ہی کے لیے خطرہ و فساد کا باعث بن جائے۔ جس طرح ایک ہتھیار اچھے اور بُرے دونوں کاموں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح علم بھی نیکی اور بدی دونوں کے لیے استعمال ہونے کی یکساں صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ اس صاحبِ علم کی اپنی صوابدید پر ہے۔ کہ وہ کس کا استعمال دونوں میں سے کون سی راہ میں کرے ؎

علم را بر جاں زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

چنانچہ اسلام نے علم و دانش حاصل کرنے کے لیے جہاں ہر ممکن ترغیب دلائی وہاں اس کے صحیح اور پاکیزہ استعمال کے لیے صرف اپنی تعلیم پر بھروسہ کیا۔ سچ کہیے جس انسان کا عقیدہ یہ ہو گا کہ تمام عالم کے انسان بحیثیت انسان مساوی ہیں، جسے یہ تعلیم ملے گی

کہ پڑوسی سواخات کے حقوق میں بعض عزیزوں اور رشتہ داروں پر بھی ترجیح رکھتے ہیں، جسے یہ بتلایا جائے گا، کہ اس وقت تک پیٹ بھر کر کھانا مناسب نہیں جب تک یہ تشفی نہ ہو جائے کہ آس پاس میں بسنے والے سب کے سب سیر ہو چکے ہیں جس پر اپنی آمدنی میں سے پانچواں اور چالیسواں حصہ خمس و زکوٰۃ کی شکل میں غرباء و مساکین میں تقسیم کر دینا واجب ہو گا، اور جس کے لائحۂ عمل یہ تجویز کیا جائے کہ اگر صرف اس قدر پانی مہیا ہو کہ جس سے یا تو وضو ہو سکے اور یا ایک پیاسے اور جاں بلب کتے کی جسے اسلام نے نجس العین ٹھہرایا ہے جان بچائی جا سکے تو اس پر واجب ہے کہ وضو کو تیمم سے بدل کر وہ پانی اس ذی روح کی نذر کر دے۔ وہ کیونکر علم و دانش اور سائنسی ترقی سے حاصل کی ہوئی تحقیقات کو انسان دشمنی اور ہلاکت آفرینی کے راستہ میں استعمال کر سکتا ہے؛ چنانچہ یورپ اس نام نہاد اور جھوٹی علمی اور سائنسی ترقی کا جو مذہب سے کٹ کر معرض وجود میں آئی ہو، تجربہ کر کے نتیجہ دیکھ چکا ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ میں علم و سائنس کی مدد سے نئے نئے مہلک اور انسان کش ہتھیار ایجاد کیے گئے۔ جنگ کے خاتمہ پر یہ ہولناک حقیقت اقوامِ عالم کو جھنجھوڑتی ہوئی ایک جھٹکے کے ساتھ سامنے آئی کہ اگر سائنس کی ان ترقیوں پر نظم و ضبط اور ضمیر و اخلاق

کا پہرہ نہ بٹھایا گیا تو بہت جلد یہ پورا کرۂ ارضی فنا کی لپیٹ میں ہوگا۔ لیگ آف نیشنز اور تخفیفِ اسلحہ کے نام پر اور بہت سے دوسرے اصلاحی ادارے قائم کیے گئے۔ لیکن چونکہ مذہب اور تعلیمات سے رشتہ نہ جوڑا گیا اس لیے ابھی پچیس برس بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ دنیا نے پھر اپنے آپ کو ایک ایسی جنگ کے شعلوں کے روبرو پایا جو پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور تباہ کن تھی۔ سچ کہیے اگر اسلام کی اس تعلیم کو اپنایا جاتا، جس کا تذکرہ ابھی ابھی اوپر ہوا تو کیا علم و سائنس کی ترقیوں کا یہی حشر ہوتا؟ اگر خدا کی حاکمیت پر ایمان ہوتا، اگر اپنے خدا کو ہم دوسروں اور غیروں کا بھی خدا جانتے ہوتے (توحید) اگر ہم اسی عدل و انصاف کو جو اپنے لیے روا رکھیں دوسروں کے لیے بھی روا رکھنے کے عقیدہ پر دل سے قائل ہوتے (عدالت) اگر حشر و نشر پر ہمارا یقین ہوتا اور نیکی کی جزا اور بدی کی سزا کے ہم قائل ہوتے (قیامت)، اگر ہم دشمنوں اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کو بھی بھائی سمجھتے ہوتے (رسالت و امامت) تو کیا یہ ممکن تھا کہ بساطِ عالم پر اس طرح قوم سے قوم ٹکراتی اور ملک سے ملک الجھتا؟ کیا اس صورت میں آتشیں بموں اور زہریلی گیسوں سے ہم بستیوں کی بستیاں آنِ واحد میں فنا کر دینے پر راضی ہوتے؟ اور کیا دنیا آج یوں تباہی و ہلاکت کے ایک عمیق غار کے کنارے اپنی فنا کی منتظر کھڑی ہوئی دکھائی دیتی؟ نہیں، ایسا ہرگز نہ ہوتا، اگر اسلامی عقائد یعنی مذہب کا پیوند علمی اور سائنسی ترقی سے لگا دیا جاتا تو عام اس سے کہ کوئی خارجی اصلاحی

ادارہ وجود میں آتا یا نہیں، یہ ناممکن تھا کہ آج دنیا میں یگانگت و مواخات کا پرچم نہ ہوتا اور صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا پیغام اس ربع مسکون کے گوشہ گوشہ میں نہ پہنچ چکا ہوتا۔ اس صورت میں یقیناً اسی سائنسی تحقیقات اور علمی ریسرچ کی یہ ساری کوششیں مہلک بیماریاں دور کرنے، انسانی زندگی کو طویل بنانے، اس کے آرام و آسائش میں اضافہ کرنے، سفر کی صعوبات مٹانے اور مفلسی کا قلع قمع کرنے میں صرف ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ علم و سائنس نے مذہب سے دور رہ کر جو بھی ترقی کی ہے وہ دراصل ترقی نہیں بلکہ۔ ع "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے مصداق وہ تنزل و انحطاط کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ صحیح ترقی تو وہی ہو سکتی ہے جس میں ان نئی نئی ایجادات کا مقصد نسلِ انسانی کی فلاح، اس کے سکھ چین میں اضافہ اور عام معاشرہ کی خوشحالی ہو۔ اور ایسی ترقی ظاہر ہے کہ مذہب کو اپنائے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔ واضح ہوا کہ صحیح اور حقیقی ترقی کے لیے مذہب نہ صرف ممد و معاون ہے بلکہ ضروری اور لابدی ہے۔

آئیے اب اسی طرح سے اخلاقی ترقی کا بھی تھوڑا سا جائزہ لیں۔ یورپ نے سائنسی ترقی کی طرح مذہب سے دور ہٹ کر اخلاقی ترقی کا بھی تلخ تجربہ کیا ہے۔ آزادی کے پردہ میں وہاں ہر طرح کی آوارگی اپنائی گئی اور نتیجہ میں حسرت و یاس اور ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکا۔ ماں باپ کے حقوق کو وہاں یہ کہہ کر پامال کیا گیا کہ بالغ ہو چکنے کے

بعد عمر کی کمی بیشی کسی سے زانوئے ادب کیوں تہہ کرائے۔ مرد کی عورت پر حاکمیت کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا گیا کہ جب دونوں نسل انسانی کے مساوی جزو ہیں تو دونوں کے حقوق کیوں مساوی نہ ہوں۔ پردہ کے نظام کو یہ کہہ کر چاک چاک کیا گیا کہ یہ انسانی آزادی پر ایک بے معنی زنجیر ہے۔ شادی وطلاق کے قواعد اس لیے الٹ دیے گئے کہ باہمی پسند و ناپسند کے بیے وقت کی، نسل کی اور قوم کی قید انسان کی مکمل آزادی پر ایک بدنما داغ ہے۔ چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا انھیں وحشیانہ اور بہیمانہ دکھائی دی۔ باہمی مفاہمت سے جنسی تعلق کو انھوں نے عیب و گناہ کی حدود سے اس لیے خارج کر دیا کہ طرفین اپنے اپنے کردار اور نفع ونقصان کے خود ذمہ دار ہیں۔ لیکن افسوس اتنا سوچنے کی کسی نے زحمت گوارا نہ کی کہ اس اندھی آزادی سے پورا معاشرہ کیسے متاثر ہوگا اور یہ یکطرفہ دوڑ آخر کہاں پہنچ کر رکے گی۔ اور اس کے نتیجہ میں بالآخر پوری قوم کس قعر مذلت سے دوچار ہو جائے گی۔ چنانچہ نتیجہ میں فواحش کا ایک ایسا طوفان اٹھا اور اس بے راہ روی کا ایک ایسا ہنگامہ خیز سیلاب امنڈا کہ بہت جلد مغرب کی پوری تہذیب نے خود کو اس کی زد میں پایا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں پوری قوم اس چوٹ کے صدمہ سے بلبلا اٹھی۔ شاعر مشرق نے سچ ہی کہا تھا ؎

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

امریکہ اور یورپ کا آج کوئی بھی جریدہ جو وہاں کے اخلاقیات پر بحث کرتا ہو یا وہاں کے آئے دن کے ثقافتی کمشنوں کی کوئی بھی رپورٹ اٹھا کر دیکھ لیجیے، صفحات کے صفحات آپ کو سیاہ داغوں اور بدنما دھبوں سے پٹے ہوئے ملیں گے۔ اعداد و شمار یہاں گنوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ فواحش کے اس سیلاب کے سامنے دانایانِ فرنگ آج اپنی مکمل بے بسی کا اعتراف کر رہے ہیں اور چاروں طرف نوجوانوں کی آوارگی، بچوں کی بے راہروی، لڑکیوں کی بے حیائی کا رونا رویا جارہا ہے۔ اور اس ناسور کے روکنے کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

غور کیجیے، اگر خدا اور خدا کی حاکمیت پر ایمان ہوگا، اگر یہ یقین ہوگا کہ وہ سب کچھ دیکھتا ، اور ہر اچھے برے اعمال کی جزا و سزا دیتا ہے (توحید)، اگر رسول اللہؐ اور امام کے منجانب اللہ ہادی ہونے کا اعتراف ہوگا اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو برحق اور واجب الاطاعت سمجھا جائے گا (رسالت و امامت) اگر عدل و انصاف کا صحیح تصور دماغ میں جاگزیں ہوگا اور کسی کمزور سے کمزور انسان سے بھی بالادستی اور زیادتی گناہ متصور ہوگی (عدالت)، اگر قیامت پر ایمان ہوگا اور یہ یقین ہوگا کہ ہمارے ہر عمل کا ریکارڈ جزا و سزا کے لیے محفوظ کیا جا رہا

رہا ہے (قیامت)۔ اگر نماز و حج و زکوٰۃ وغیرہ سے اپنے آپ کو ایک باقاعدہ اور مستقل دستورالعمل کی زنجیروں کا عادی بنایا جائے گا اور اگر روزہ سے دوسروں کی بھوک پیاس اور ان کی مفلسی و بے بسی کا مزہ چکھ لیا جائے گا (جملہ فروعِ دین) تو بتلائیے کیا یہ ممکن ہے کہ اخلاقیات کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی فروگذاشت بھی انسان سے سرزد ہو سکے؟ کیا اس حالت میں معاشرہ میں ذرہ برابر کمی آنے اور معمولی سے معمولی ابتری پھیلنے کا کوئی بھی امکان باقی رہ سکے گا؟ اور کیا سوسائٹی میں افراتفری، لوٹ مار، جبر و تشدد اور انارکی نام کو بھی باقی رہ جائے گی؟ نہ کسی کے حقوق کی پامالی کا کوئی سوال پیدا ہوگا اور نہ سوسائٹی ابتری اور بداعمالی کے ناپاک حملوں سے مجروح ہوگی۔ قرآن کی بیسیوں آیتیں اور پیغمبرِ اکرمؐ کی سیکڑوں حدیثیں نقل کی جا سکتی ہیں جو اخلاقِ حسنہ، نیک اعمال اور ایمانداری و دیانت کی تائید میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی تکرار یہاں اس لیے ضروری نہیں کہ وہ سب کی سب دراصل انھیں اصول و فروعِ دین کی وضاحت کرتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا اور جن پر عقیدہ رکھتے ہوئے انسانی ذہن اخلاقی بداعمالیوں اور برائیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک نکتہ کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے

مغرب نے اور خصوصاً انگلستان نے جہاں مذہب کی اور بہت سی حدود کو پامال کیا ہے وہاں روزمرہ کے لین دین میں دیانت و ایمانداری کا ایک اعلیٰ اور قابلِ رشک معیار قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں روزمرہ کے کاروبار میں جھوٹ، فریب اور دغابازی سے بالعموم احتراز کیا جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہاں معاشرہ کی یہ سطح قابلِ قدر حد تک پاکیزہ اور خوشگوار ~~ہے~~ غور سے دیکھا جائے تو ترقی کا یہ پہلو بھی دراصل مذہب کا مرہونِ منت ہے۔ اسلام نے ایمانداری، دیانت، راست گوئی خوش معاملگی اور سچ کو شریعت میں واجب قرار دے کر ان خصوصیات کو ہر مسلمان کے لیے طرۂ امتیاز بنا دیا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ مسلمان تو ان زیورات کو فضول و بیکار سمجھ کر پھینک دیں اور دوسرے انھیں مفید و سودمند پا کر زیبِ تن کر لیں اور معزز و مکرم بن جائیں ؎

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بُت میں وفا ہے تو سہی

بہرحال ترقی وہی ہے جو مذہب کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر آگے بڑھے، جو مذہب کے مضبوط بازوؤں سے سہارا پائے اور جس کی بنیادوں کو مذہب نے استحکام بخشا ہو۔ اصلی اور حقیقی ترقی مذہب کے بغیر کبھی پنپ نہ سکے گی اور صحیح ترقی کا تصور ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا جب

تک مذہب اسے معاونت نہ بخشے گا۔

روحانی ترقی سے قطع نظر کرکے آئیے اب مادی ترقی کا بھی مختصر سا جائزہ لیں۔ اسلام کا نہایت آسان اور واضح تقاضا ہے کہ نہ انسان ہر کسی بے بیاہ شادی کا رشتہ قائم کرسکتا ہے اور نہ ہر حرام و حلال اس کے دسترخوان کو زینت دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں گذشتہ باتیں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ صرف یہی کافی ہوگا کہ جنسی تعلقات کے قائم کرنے میں اگر حلال و حرام کی قیود نظرانداز کردی جائیں تو کون نہیں جانتا کہ وراثت و ترکہ کا نظام الجھ کر ابتری و بدنظمی کے ایک ایسے بھنور کی صورت اختیار کرلے گا کہ پورا معاشرہ اس صدمہ سے چلا اٹھے گا۔ رہی رشتہ و ناطہ کی قیود تو جدید طبی ریسرچ نے یہ بالکل واضح کردیا ہے کہ جنسی ارتباط اس نوع کا ہونا چاہیے کہ طرفین کی نسلی اور جسمانی کمزوریاں ایک دوسرے سے متاثر اور متصادم ہو کر مٹتی چلی جائیں اور ان دونوں کے اشتراک سے جو اولاد پیدا ہو وہ مضبوط اور صحت مند ہو۔ یونہی غذا و خوراک کے مسئلہ میں بھی جدید تحقیقات نے اس پر زور دیا ہے کہ اجزائے تغذیہ نہ صرف حرام جانوروں کے گوشت میں حلال جانوروں کی نسبت بہت کم ہیں بلکہ اکثر قسم کے لوگوں کے لیے حرام جانوروں کا گوشت مضر و نقصان دہ بھی ہے۔ اور بہت سی بیماریاں اسی سے جنم لیتی ہیں۔ اسی طبعی تحقیق نے یہ بھی ثابت کردیا ہے

کہ اسلامی طریقہ سے ذبح کیا ہوا گوشت ایک غیر اسلامی طریقہ سے گردن مروڑے ہوئے جانور کی نسبت بہت زیادہ صالح اور صحت مند ہے

علاوہ ازیں اسلام چاہتا ہے کہ مال کی طرح انسان وقتاً فوقتاً جسم کی بھی زکواۃ، روزہ و حج و جہاد کی صورت میں ادا کرے۔ تاکہ کمزور و ناتوان اور بیمار لوگوں کی بے بسی کا احساس اس میں مردہ نہ ہونے پائے۔ سچ کہیے اگر اس قسم کی بندشیں اور قیود عائد نہ کردی جائیں تو پھر کیا انسان بھی ایک حیوان کی سطح پر نہ آجاتا کہ جو جس کھیت میں چاہے چرلے اور جہاں چاہے حوائج ضروریہ سے فارغ ہولے۔ کیا اس صورت میں وہ حیوانی ترقی جو خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کے نتیجہ میں حاصل ہوتی انسانی معاشرہ کو یکسر درہم برہم نہ کردیتی؟ اور کیا اس کے نتیجہ میں ہمسائے کا ہمسایہ سے الجھنا، پڑوسی کا پڑوسی کی جیب کاٹنا، ایک کا دوسرے کے حقوق پامال کرنا اور دوسرے کا اس کے احساسات کو بے محابا روندنا انسان کو ایک تباہ کن بدنظمی کا شکار نہ بنا دیتا؟

اور یہی حال تجارتی اور معاشی ترقی کا ہے۔ ایک معیاری اور مثالی معاشرہ میں ظاہر ہے کہ آپ یہی توقع رکھیں گے کہ وہاں انسان ہر طرح سے فارغ البال اور مرفع الحال ہو۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور دوسری ہر قسم کی ضروریات زندگی ہر ایک کے لیے بآسانی حاصل ہوں اور جو لوگ بدقسمتی

سے کسی مرض یا کسی فطری کمزوری کے سبب ناکارہ ہو چکے ہوں ان کے لیے بھی ضروریات زندگی اس طرح سے مہیا کی جائیں کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے پائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف انسانوں کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ مبدا فیاض نے بنی نوع انسان کو جو ہر قابلیت بخشنے وقت ایک ہی پیمانہ سے عطا نہیں کیا اور اس نے صحن عالم میں تخم ریزی بعض کو بعض پر ترجیح کے اصول پر کی ہے۔ اس کی اپنی مشیت وہ خود جانے، لیکن کون انکار کر سکتا ہے کہ اس نے کسی کو ذہین پیدا کیا اور کسی کو غبی۔ کسی کو چستی و چالاکی کے زیورات سے مزین کیا اور کسی کو سستی اور کاہلی بخشی، کسی کو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے کی توفیق عطا کر دی اور کسی کو گھر کی چار دیواری سے بھی قدم باہر نکالنے پر قادر نہ ہونے دیا۔

قسمت کیا ہر چیز کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

اور چونکہ ہر انسان کی قوت و صلاحیت الگ الگ تھی اس لیے یہ ناانصافی ہوتی اگر معاشرہ میں اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جاتا چنانچہ ایک مثالی معاشرہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ محنتی اور جفاکش انسانوں کو ترقی کی منازل طے کرنے اور اپنی کاوشوں سے بنجر

اور ویران زمینوں کو لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب باغات میں تبدیل کر دینے کے مواقع مہیا ہوتے۔ اور یونہی تجارتی میدان میں جس کا جی چاہتا زور بازو اور سعی و محنت سے روپیہ کما کر اپنے کاروبار کو وسعت دے سکتا اور عیش و آرام کے سامان زیادہ سے زیادہ فراہم کر سکتا۔ غور کیا جائے تو ذرہ برابر شبہ نہیں رہتا کہ اسلام نے تجارتی اور معاشی میدان میں بالکل اسی قسم کی ایک صحت مند اور خوشحال سوسائٹی کو جنم دینے کی کوشش کی ہے۔ اس نے ترقی کرنے اور نشو و نما پانے کے جذبہ پر کوئی بندش عائد نہیں کی۔ جو چاہے روپیہ کمائے اور جس قدر چاہے اپنی دولت کو وسعت دے۔ پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسے روکنا یا اسے سلب کرنے کی کوشش کرنا عدل و انصاف کے منافی ہوگا۔ اسے تیشہ کی زد میں لانا نوع انسانی کو بیمار کر دیگا۔ لیکن ہاں خبردار! یہ جذبہ بڑھتا بڑھتا کہیں سرمایہ داری اور زر اندوزی کی شکل اختیار نہ کر لے۔ سرمایہ داری ایک لعنت ہے جو ضمیر کو مردہ اور نفس ناطقہ کو مدقوق کر دیتی ہے۔ دیکھو، مال کا پانچواں حصہ خمس میں اور چالیسواں حصہ زکواۃ میں تو تمہیں دینا ہی ہوگا، یہ تو فرض ہے، ہاں اس کے علاوہ جتنے جتنے مال میں تم غربا، و مساکین کو برضا و رغبت شریک

کرتے جاؤ گے اُتنا اُتنا تم رحمتِ خداوندی سے قریب اور اس رحمان و رحیم کی عطا و بخشش کے زیادہ مستحق ہوتے چلے جاؤ گے۔ دیکھو فقراء و مساکین کو کہیں ہیٹا اور ذلیل نہ سمجھ بیٹھنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہشت میں سب سے پہلے قدم رکھیں گے۔ تم دولت مندوں کی نسبت یہ مجھے کہیں زیادہ محبوب ہیں اور جس نے ان کی دستگیری کی اس نے گویا میری دستگیری کی۔

یہی نہیں بلکہ تجارتی ترقی کی ترغیب نئے سے نئے انداز میں دلائی۔ کبھی "سیروا فی الارض" کہہ کر کسبِ معاش کے لیے چاروں طرف پھیل جانے کا حکم دیا۔ کبھی فرمایا، دیکھو رزق کے دس حصے ہیں جن میں سے نو کو صرف تجارت میں حصر کر دیا گیا ہے۔ پیغمبرِ ختمی مرتبت ؐ نے خود اپنے لیے پیشہ بھی تجارت ہی منتخب کیا تاکہ مسلمان تجارت کو فروغ دینا سنت میں شامل کریں۔ کسبِ حلال میں پسینہ بہانے کو عبادت کہا، اور معاشی فراغت حاصل کرنے کو نعمت کا نام دیا۔ غور تو کیجیے کہ اس تجارتی ترغیب و تحریص کے ساتھ جود و سخا اور خیرات و ایثار کا پیوند لگا کر اسلام نے جس تجارتی اور اقتصادی ترقی کی داغ بیل ڈالی وہ کس قدر متوازن و معتدل اور خوشگوار و دلفریب تھی اور جہاں یہ پیوند نہ لگ سکا اور مذہب دور

کھڑا منہ دیکھتا رہا وہاں اسی ترقی نے جلد یا بدیر کیونکر ایک گھناؤنی اور منحوس سرمایہ داری کا روپ اختیار کر لیا۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ مغرب نے اس تجربے کا تلخ مزہ بھی چکھا۔ انیسویں صدی کے ابتداء میں آہستہ آہستہ سرمایہ داروں نے جب وہاں غرباء و مساکین کا خون چوس چوس کر انہیں ایک تباہ کن معاشی بدحالی میں گرفتار کر دیا تو نتیجہ میں اس کا ردِ عمل اشتراکیت کے مہیب ہیولیٰ کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور جب اشتراکیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان نے رفتہ رفتہ باقی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہا تو چاروں طرف افراتفری اور ایک گھبراہٹ پھیلنے لگی۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جس مرض کا علاج سرمایہ داری نہ ڈھونڈھ سکی تھی وہ اب بھی ویسا ہی لاعلاج تھا۔ کیونکہ اشتراکیت اندر سے تو وہی پرانا ناسور تھا جو معاشرہ کے جسم سے اب جگہ بدل کر رسنے لگا تھا۔ نام بدلنے سے حقیقت کیونکر بدل جاتی! اور افراط و تفریط اعتدال کی جگہ کیسے پُر کر لیتے؟ وجہ یہ تھی کہ دنیا کے معاشی نظام کو جس چیز کی در اصل ضرورت تھی وہ تھی انسانی اخوت و ہمدردی اور جذبات و احساسات کی لچک اور یہ چیز بدقسمتی سے نہ سرمایہ داری کے پاس دستیاب تھی اور نہ اشتراکیت کے پاس۔ اس سے تو دونوں کے خزانے یکسر خالی تھے۔ اور اگر اس کیمیا کو کوئی مہیا کر سکتا تھا تو وہ تھا مذہب اور صرف مذہب۔ جب تک مذہب آگے بڑھ کر تقویٰ

خوفِ خدا، جزا و سزا پر ایمان، حلال و حرام کی تمیز، عدل و انصاف کا احساس اور اس قسم کے لطیف جذبات عوام کے دلوں میں نہ پھونک دے "جیو اور جینے دو" کی عمارت کیونکر کھڑی رہ سکتی تھی؟ سرمایہ داری میں ان عقائد کا فقدان تھا اور اشتراکیت کو سرے سے انکار، زبان سے تو بلاشبہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں غریب کو سہارا دینے کے مدعی ہیں۔ ایک بہادر و بزدل جفاکش و کاہل، مستحق و غیر مستحق اور انسان و حیوان میں فرق کیے بغیر یکسانی و یک رنگی کا آرا چلا کر اور دوسرا لاچاری کے بوجھ سے دب کر اور مجبوری کی چوٹ کھا کر۔ لیکن سچ کہیے کیا یہ غریب پروری اور مسکین نوازی اس دوسری قسم کی ملکوتی مواخات سے آنکھ ملا سکتی ہے۔ جس کے سوتے ضمیر کی بیداری، خوفِ خدا پاکیزگیٔ نفس اور تقویٰ و خیر سگالی کے جذبات سے پھوٹے ہوں۔ کہاں بحیرۂ مردار کا شور پانی، اور کہاں چشمۂ کوثر کا آبِ زلال سے

نازش ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں مشہور
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

آئیے کوفہ میں اور دیکھیے، امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ بازار سے دو پیرہن خریدتے ہیں، ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنے غلام قنبر کے لیے، ایک پیرہن کسی قدر موٹا اور سستا ہے

اور دوسرا نفیس اور قیمتی۔ امامؑ قیمتی پیرہن قنبر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قنبر عرض کرتا ہے، مولا اسے آپ رکھیں، آپ میرے آقا ہی نہیں حاکمِ وقت بھی ہیں۔ فرمایا، قنبر تم ابھی جوان ہو تمھارے لیے یہی پیرہن مناسب ہوگا اور میری عمر تو اب ڈھل رہی ہے مجھے اس قیمتی لباس کی کیا ضرورت؟ دیکھی آپ نے ساقیٔ کوثر کی مروّت اور عالی ظرفی؟ کہنے کو تو آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ دیکھو قنبر تم غلام ہو اور ہمیں غلاموں سے مساوات کا سلوک کر کے انھیں معاشرہ میں بلند اور معزز و محترم کرنا ہے۔ لیکن سچ کہیے اس سے قنبر کے ضمیر پر کس قسم کی چوٹ پڑتی اور اس کا عزتِ نفس کا جذبہ کتنا مجروح ہوتا؟ اور خود سرمایہ داری کی زہریلی روح اس سے کس قدر پرورش پاتی؟ امام نے غلام کو ممنون نہیں ہونے دیا۔ بلکہ حسنِ عطا سے تعلیمِ اسلامی کی ایک مفصل تفسیر کر دی۔

اس مختصر سی بحث کے بعد قارئین خود فیصلہ کریں کہ معاشی اور تجارتی ترقی کے لیے اور اسی طرح دوسری ہر قسم کی نشوونما کے لیے اسلام مانع ہے یا ممد و معاون اور اس کی یہ معاونت کس حد تک وزنی اور گراں قدر ہے۔

یہاں مسئلہ کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اقتصادی اور معاشی ترقی کے لیے موجودہ نظام میں بنک ایک ناگزیر ادارہ ہے اور اسے گوارا

کرنا گویا سود و ربوٰہ کو گوارا کرنا ہوگا۔ وہ سود جسے قرآنِ مجید نے حرام کیا ہے وہ کس قسم کا سود ہو سکتا ہے اور اس سے کس قسم کی سرمایہ داری اور غربا آزاری کی لعنت سے معاشرہ کو پاک کرنا مقصود تھا یہ تو آپ کو علماء بتلائیں گے۔ لیکن یہاں اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ سود حرام کرنے کے ساتھ ساتھ شریعتِ طیبہ نے مِل جل کر اور اشتراکِ عمل سے کاروبار چلانا تو حرام نہیں کر دیا۔ یقیناً تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ بنک کو آئینی طور پہ ایک ایسی شکل میں ضرور ڈھالا جا سکتا ہے جس سے بنک کے حصہ دار اور بنک کی مدد سے کاروبار چلانے والے عوام ایک ایسی کاروباری شراکت کے رشتہ میں پروئے جا سکیں جس پہ شرعی حیثیت سے کوئی انگلی نہ اُٹھ سکے۔

آخر میں اب ایک الجھن ہے جو تھوڑی سی وضاحت چاہتی ہے۔ جب دینِ اسلام اس قدر متوازن و مکمل مذہب ہے تو آخر اس کے ماننے والوں نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کا دامن دولت و ثروت اور جاہ و حشم سے خالی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اقوامِ عالم میں مسلمان سب سے بڑھ کر بامِ عروج و کمال کی زینت نظر آتے۔ ہر منزل پہ کامیابی و سرفرازی ان کے قدم چومتی اور آج شادکامیوں اور کامرانیوں سے ان کی قسمت کا جام چھلک رہا ہوتا۔ لیکن ہوا یہ

کہ بساطِ عالم پر اس قوم نے بار بار مات کھائی۔ اور ذلت و رسوائی کا منحوس سایہ ان سے الگ نہ ہو سکا۔ اس سوال کا جواب ایک حد تک پہلے دیا جا چکا ہے۔ اسلام کی پاک و پاکیزہ تعلیم کو اگر اس کے ماننے والوں نے صحیح طور پر نہ اپنایا۔ دین کے حقیقی وارثوں کا دامنِ فیض چھوڑ کر اگر انھوں نے ادھر ادھر بھٹکنے کو ترجیح دی اور ان کی صحیح تعلیم سے استفادہ کرنے کے بجائے اگر وہ خالی خولی روایات میں ہی کھو کر رہ گئے تو اس میں بیچارے دین کی کیا خطا ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

آپ نے دیکھا نہیں، کس طرح اس خوانِ یغما سے ریزہ چینی کر کے اغیار کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور کیونکر راہ چلتے مسافروں نے اپنے دامن اس خزانۂ عامرہ کے ادھر اُدھر گرے پڑے لعل و جواہر سے بھر لیے۔ نہ کوئی سننے والا ہو تو اسلام آج بھی زبانِ حال سے اپنی بے بسی پر نوحہ کر رہا ہے ؎

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

باہر سے آ کر کسی حملہ آور نے اس دین کی سلطنت کو

تاراج کیا ہوتا تو اتنا دکھ نہ ہوتا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جنھیں ہم محپلیاں سمجھے تھے "مارِ آستیں نکلے" کے مصداق یہاں خود سلاطین خانہ ہی نے لوٹ مچائی۔ دین کے محافظ دو ہی طبقے ہو سکتے تھے، علماء و سلاطین اول الذکر نے خود غرضیوں اور جاہ پرستیوں کی آڑ میں غلط سلط احادیث و فتاویٰ کا ایک ایسا تانا بانا بنا کہ قرآن اس صدمہ سے تڑپ اٹھا ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

رہے خدایانِ ملت، تو انھوں نے ابتداء ہی سے ترویج دین کے بجائے سلطنت و فتوحات کو اپنا منتہائے مقصود بنا لیا۔ خدا کی قسم اسلام تو آبِ شیریں کا ایک ابلتا ہوا چشمہ تھا جس سے جو بھی چاہتا پیاس بجھاتا۔ اور اس میں کوئی کمی نہ آتی ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

علومِ محمد و آلِ محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سب سے بڑی نشرگاہ

امامیہ مشن پاکستان

کے زرّیں کارنامے

۱۔ تقریباً دو صد کتابچے مختلف موضوعات پر شائع کیے جا چکے ہیں۔
۲۔ اردو کے علاوہ انگریزی، گجراتی، سندھی، بنگالی اور پشتو میں بھی لٹریچر شائع کیا جاتا ہے۔
۳۔ امامیہ مشن کے ذیلی شعبہ مکتبہ امامیہ کے زیر اہتمام تقریباً تیس ضخیم کتب شائع ہو چکی ہیں۔
۴۔ تمام لٹریچر بلا محصول شائع ممبران کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔
۵۔ ماہنامہ پیامِ عمل قوم کو تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کی دعوت دیتا رہتا ہے۔
۶۔ مشن کے تربیت یافتہ سیکڑوں مبلغین بلا معاوضہ تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔
۷۔ شعبہ شادی اپنی اہمیت کے لحاظ سے قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔
۸۔ پاکستان کے علاوہ انگلستان، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ممالکِ افریقہ، عراق، ایران، شام، عدن وغیرہ میں بھی آلِ محمد کا پیغام بھیجا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ

قوم کے تعاون سے ہو رہا ہے اس وقت سات ہزار سے زائد ممبران خصوصی، چھ سو سے زائد ممبران مربی اور پچاس سے زائد سرپرست حضرات اس اہم دینی ادارہ سے منسلک ہیں

آئندہ پروگرام

اللہ کا شکر ہے کہ انجمن حسینیہ مجاہدت نگر کے تعاون سے امامیہ بارہ مجاہدت نگر میں حسب ذیل عمارات کی تعمیر کا منصوبہ بنایا ہے۔

(۱) مسجد (۲) امامبارہ (۳) امامیہ مشن کے دفاتر (۴) امامیہ پبلک لائبریری (۵) مسافرخانہ (۶) امامیہ مشن پریس (۷) مدرسۃ المبلغین۔

لہٰذا قوم کے اہل درد حضرات سے اپیل کی جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں مشن سے حسب ذیل طریقوں سے تعاون فرما کر ممنون فرمائیں۔ اور عنداللہ و عندالرسول ماجور ہوں۔

۱۔ مشن کی ممبری قبول فرما کر:- چندہ ممبر خصوصی پانچ روپے سالانہ
چندہ ممبر مرتی کمیعد روپیہ یکمشت دیکر
چندہ سرپرست پانچصد روپیہ یکمشت دے کر

۲۔ بلڈنگ فنڈ میں عطیہ دے کر

۳۔ خمس، سہم امام میں سے مشن کی امداد فرما کر

نوٹ:- آقائے سید محسن حکیم مجتہدِ اعظم مدظلہ نے ایک لاکھ روپیہ تک کا اجازہ مرحمت فرمایا ہے۔

مینجنگ ٹرسٹی

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ - آکرم روڈ، مجاہدت نگر

لاہور

(تعلیمی پریس لاہور)

ضمیمہ ماہنامہ پیام عمل لاہور اگست ۱۹۶۵ء رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۰۷